مولانا مودودیؒ
پر
اعتراضات کی حقیقت
عاصم نعمانی
مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی ۲۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیشِ لفظ

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ دکن کے مشہور و معروف شہر اورنگ آباد میں ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷۹ء میں انتقال فرمایا۔ مولانا کی شخصیت داعئ اسلام کی تھی۔ مولانا کی تحریروں اور ان کی عملی سرگرمیوں نے ایک ایسا عظیم فکری انقلاب برپا کیا جس کی مثال تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔

مولانا نے اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں میدان صحافت میں قدم رکھا۔ اس وقت سیاسی، نیم سیاسی اور مذہبی تنظیمیں میدان میں سرگرم عمل تھیں۔ مولانا کو بہت جلد یہ احساس ہوگیا کہ مسلم رہنماؤں کے کرنے کا اصل کام کچھ اور ہی ہے۔ مولانا اپنے احساسات مدلل طریقے سے اپنے رسالہ ترجمان القران میں پیش کرنے لگے۔ انھوں نے بتایا کہ قرآن کی ہدایت کی روشنی ہی میں راہ اور منزل کا تعین ممکن ہے۔ قرآنی ہدایت سے بے نیاز ہوکر ہمارے لیے صراطِ مستقیم پر گامزن ہونا ممکن نہیں۔

مولانا کی آواز اور دعوت پر کچھ اصحاب جمع ہوئے اور اس طرح اسلامی

نصب العین کے حصول کے لیے اجتماعی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ اس جدوجہد کے لیے مولانا نے اپنی پوری زندگی وقف کردی حتیٰ کہ تختۂ دار پر اپنی جان دے دینی قبول کی لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی باطل کے سامنے جھکنا پسند نہ کیا۔

اس کے علاوہ قرآن، حدیث اور فقہ جیسے خالص دینی علوم کے میدان میں بھی آپ کی خدمات جلیلہ ہمیشہ ناقابلِ فراموش رہیں گی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دینِ حق کے عظیم خادموں کو تاریخ میں اپنوں کی ملامتوں اور طنز و تعریض کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے۔ مولانا مودودی علیہ الرحمہ کو بھی طرح طرح سے موردِ الزام ٹھہرایا گیا، ان الزامات کا تعلق عقائد و افکار سے بھی رہا ہے اور دوسرے مسائل دین سے بھی۔ بلکہ ان کی نیتوں تک پر حملے کیے گیے۔ لیکن مولانا نے جس صبر و تحمل اور بردباری کا مظاہرہ فرمایا وہ ان کے اعلیٰ کردار اور ان کے ذہن کی پاکیزگی کا بیّن ثبوت ہے۔

یہ مختصر سی کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، مولانا کی زندگی میں مرتب کی گئی تھی۔ مولانا مودودیؒ اپنے رب کے پاس جا چکے ہیں لیکن اس کتاب کی افادیت اب بھی باقی ہے۔ اُمید ہے ہمارے قارئین اس سے پورا استفادہ فرمائیں گے۔

ناشر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان نصف صدی سے اعلائے کلمۃ اللہ اور دینِ اسلام کی سربلندی کے لیے دن رات سرگرم عمل ہیں۔ موصوف اپنے عنفوان شباب سے اب تک مسلسل اور غیر منقطع طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے نام کا آوازہ بلند کرتے چلے آرہے ہیں۔ اقامت دین ان کا نصب العین اور دین دشمن خیالات و افکار کی بیخ کنی ان کا وظیفۂ حیات ہے۔ اپنی ساری زندگی انہوں نے اسلام کی خدمت میں لگا دی ہے۔ کلمۃ اللہ کی عظمت و حرمت کی خاطر وہ ہر طرح کی آزمائشوں میں سینہ سپر رہے ہیں۔ بارہا قید و بند کی سختیاں خندہ پیشانی سے جھیل چکے ہیں۔ اپنوں اور بیگانوں کی مخالفت، الزام تراشی، بہتان و افترا اور سبّ و شتم سہتے چلے آرہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو ایسا دل و دماغ دیا ہے کہ نہ مایوس ہوتا ہے، نہ سست پڑتا ہے، نہ بکتا ہے اور نہ خدا کے سوا کسی کا خوف رکھتا ہے۔ ایک ایسے آدمی کی طرح جو آخرت کو اپنی منزل بنائے ہوئے، تقدیر الٰہی پر راضی، ہر حال میں صابر و شاکر اپنے نصب العین کی راہ میں لومتِ لائم سے بے نیاز ٹھٹکے اور رُکے بغیر اپنی راہ پر چلا جا رہا ہے، اقامتِ دین اور دعوتِ حق کے راستے پر گامزن ہے۔ کانٹے چبھتے ہیں، کنکر زخمی کرتے ہیں، خون ٹپکتا ہے، مگر اسے پروا نہیں ہے، اپنی دھن میں مست، اپنے ناقابلِ شکست عزم کی چادر اوڑھے ہوئے جادۂ صبر و استقامت پر خراماں خراماں آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

اِدھر علماء کا ایک گروہ ہے جو بزعم خویش وارثِ انبیاء ہونے کا دعویدار ہے، مولانا مودودی صاحب پر الزامات، بہتان تراشی اور افترا پردازی میں اپنے پورے علم وتقوی کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ برسوں کے پٹے ہوئے بے سروپا الزامات کا آئے دن اعادہ کرتے رہتے ہیں۔ اور ہر بار یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ گویا کوئی نئے اعتراضات ہیں جن کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ حالانکہ ان میں سے ہر ایک کا جواب بڑی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ دیا جا چکا ہوتا ہے۔

مولانا مودودی صاحب کا طریقہ یہ ہے کہ اگر کوئی معقول اور علمی اعتراض ہو تو ایک دفعہ اس کا جواب وضاحت سے دے دیتے ہیں۔ اس کے بعد جو شخص اسے دہراتا ہے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں کہ جب تک چاہے اپنا وقت اور اپنی صلاحیتیں اس میں کھپاتا رہے۔

اس مضمون میں اسی قسم کے اعتراضات کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ اگرچہ ان اعتراضات کے جوابات پہلے دیئے جا چکے ہیں اور وہ شائع شدہ موجود ہیں تاہم جو حضرات ضخیم کتابیں پڑھنے کی فرصت نہیں رکھتے ان کی ضرورت کو سامنے رکھ کر یہ مضمون لکھا گیا ہے۔

دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا

پہلا بنیادی اختلاف یہ بیان کیا جاتا ہے کہ :- "مولانا مودودی دو بہنوں کا نکاح ایک مرد کے ساتھ جائز قرار دیتے ہیں جو کہ قطعاً حرام ہے۔"

جہاں تک دو بہنوں کا بیک وقت ایک مرد کے نکاح میں جمع کرنے کا تعلق ہے، اس کی حرمت قرآن کریم سے دلالت النص کے طور پر ثابت ہے۔

سورہ النساء، آیت ۲۳ میں ہے

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ..... تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۳۳۹

پر مولانا مودودی صاحب نے آیت کے اس حصے کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

"اور یہ بھی تم پر حرام کیا گیا ہے کہ ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرو۔"

اس پر مولانا مودودی صاحب نے جو تفسیری نوٹ تحریر فرمایا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو!

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے کہ خالہ اور بھانجی، اور پھوپھی اور بھتیجی کو بھی ایک ساتھ نکاح میں رکھنا حرام ہے۔ اس معاملہ میں یہ اصول سمجھ لینا چاہیے کہ ایسی دو عورتوں کو جمع کرنا بہر حال حرام ہے جن میں سے کوئی ایک اگر مرد ہوتی تو اس کا نکاح دوسری سے حرام ہوتا۔"

یہ تو تھی مسئلے کی عام نوعیت۔ اب ایک خاص واقعہ پیش آتا ہے جس کے حل کے لیے — سائل مولانا مودودی صاحب سے رجوع کرتا ہے۔ صورت مسئلہ یہ ہے۔

"بہاولپور میں دو توام لڑکیاں متحد الجسم ہیں۔ یعنی جس وقت وہ پیدا ہوئیں کندھے پہلو کولہے کی ہڈی تک آپس میں جڑے ہوئے تھے، اور کسی طرح ان کو جدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اپنی پیدائش سے جوان ہونے تک وہ ایک ساتھ چلتی پھرتی ہیں۔ ان کو بھوک ایک ہی وقت میں لگتی ہے پیشاب پاخانہ کی حاجت ایک ہی وقت میں ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر انہیں سے کسی ایک کو کوئی عارضہ لاحق ہو تو دوسری بھی اسی مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان کا نکاح ایک مرد کے ساتھ ہو سکتا

ہے یا نہیں ؟ ....''

اس سوال کا جو جواب مولانا مودودی صاحب نے دیا تھا وہ یہ تھا !

'' ان دو توأم لڑکیوں کے معاملہ میں چار صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ دونوں کا نکاح دو الگ شخصوں سے کیا جائے۔ دوسری یہ کہ ان میں سے کسی ایک کا نکاح ایک شخص سے کیا جائے اور دوسری محروم رکھی جائے۔ تیسری یہ کہ دونوں کا نکاح ایک ہی شخص سے کر دیا جائے۔ چوتھی یہ کہ دونوں ہمیشہ نکاح سے محروم رہیں۔

ان میں سے پہلی دو صورتیں تو ایسی صریح ناجائز، غیر معقول اور ناقابل عمل ہیں کہ ان کے خلاف کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہے۔ اب رہ جاتی ہیں آخری دو صورتیں، تو یہ دونوں قابل عمل ہیں۔ مگر ایک صورت کے متعلق علماء کہتے ہیں کہ یہ چونکہ جمع بین الاختین کی صورت ہے جسے قرآن نے صریح طور پر حرام قرار دیا ہے اس لئے لامحالہ آخری صورت پر ہی عمل کرنا ہوگا۔

بظاہر علماء کی یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ دونوں لڑکیاں توأم بہنیں ہیں اور قرآن پاک کا یہ حکم صاف اور صریح ہے کہ دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ لیکن اس پر دو سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

۱ - کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ ان لڑکیوں کو دائمی تجرّد پر مجبور کیا جائے اور یہ ہمیشہ کے لیے نکاح سے محروم رہیں ؟

۲ - اور کیا قرآن کا یہ حکم واقعی اس مخصوص اور نادر صورت حال کیلئے ہے جس میں یہ دونوں لڑکیاں پیدائشی طور پر مبتلا ہیں ؟

میرا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس مخصوص حالت کے لیے نہیں ہے، بلکہ

اس عام حالت کے لیے ہے جسمیں بہنوں کا وجود الگ الگ ہو۔ اور وہ ایک شخص کے جمع کرنے سے ہی بیک وقت ایک نکاح میں جمع ہو سکتی ہیں۔ ورنہ نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ عام حالات کے لیے احکام بیان کرتا ہے اور مخصوص، شاذ، نادرالوقوع یا عسیرالوقوع حالات کو چھوڑ دیتا ہے۔ اسطرح کے حالات سے اگر سابقہ پیش آجائے تو تفقہ کا تقاضا یہ ہے کہ عام حکم کو ان پر جوں کا توں چسپاں کرنے کے بجائے صورت حکم کو چھوڑ کر مقصدِ حکم کو مناسب طریقے سے پورا کیا جائے۔ اسکی نظیر یہ ہے کہ شارع نے بالفاظ صریح روزے کے لیے یہ حکم دیا ہے کہ طلوع فجر کیساتھ اس کو شروع کیا جائے اور رات کا آغاز ہوتے ہی افطار کیا جائے۔

یہ حکم زمین کے اس حصے اور اس علاقے کے لیے ہے جن میں رات دن کا الٹ پھیر چوبیس گھنٹوں کے اندر پورا ہوتا ہے اور حکم اس شکل میں بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ زمین کی آبادی کا بیشتر حصہ ان ہی علاقوں میں رہتا ہے۔ اب ایک شخص سخت غلطی کرے گا اگر اس حکم کو ان مخصوص حالات پر جوں کا توں چسپاں کر دے گا جو قطبِ شمالی کے قریب علاقوں میں پائے جاتے ہیں جہاں رات اور دن کا طول کئی کئی مہینوں تک ممتد ہو جاتا ہے۔ ایسے علاقوں کے لیے یہ کہنا کہ وہاں بھی طلوعِ فجر کے ساتھ روزہ شروع کیا جائے اور رات آنے پر کھولا جائے۔ یا یہ کہ وہاں سرے سے روزہ رکھا ہی نہ جائے، کسی طرح صحیح نہ ہو گا۔ تفقہ کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے مقامات پر صورتِ حکم کو چھوڑ کر حکم کا منشا کسی مناسب صورت سے پورا کیا جائے۔ مثلاً یہ کہ روزوں کے لیے ایسے اوقات مقرر کر لیے جائیں جو زمین کی بیشتر آبادی کے اوقاتِ صوم سے ملتے جلتے ہوں۔

یہی صورت میرے نزدیک ان دو لڑکیوں کے معاملہ میں اختیار کرنی چاہیے

جن کے جسم آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ ان کا نکاح دو الگ شخصوں سے کہنے یا سرے سے نکاح ہی نہ کرنے کی تجویزیں غلط ہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ ان تجمعوا بین الاختین کے ظاہر کو چھوڑ کر صرف اس کے منشا کو پورا کیا جائے۔

حکم کا منشا یہ ہے کہ دو بہنوں کو سوکناپے کی رقابت میں مبتلا کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ یہاں چونکہ ایسی صورت درپیش ہے کہ دونوں کا نکاح یا تو ایک ہی شخص سے ہوسکتا ہے۔ یا پھر کسی سے نہیں ہوسکتا۔ اس لیے یہ فیصلہ انہی دو بہنوں پر چھوڑ دیا جائے کہ آیا وہ بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں جانے پر راضی ہیں یا دائمی تجرد کو ترجیح دیتی ہیں۔ اگر وہ پہلی صورت خود قبول کریں تو ان کا نکاح کسی ایسے شخص سے کر دیا جائے جو انہیں پسند کرے۔ اور اگر وہ دوسری صورت ہی کو ترجیح دیں تو پھر اس ظلم کی ذمہ داری سے ہم بھی بری ہیں اور خدا کا قانون بھی " (ترجمان القرآن نومبر ۱۹۵۴ء)

مولانا مودودی صاحب کا جواب مدلل اور واضح ہے کوئی شخص اس کو پڑھ کر اس سے اختلاف تو کر سکتا ہے لیکن یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ مولانا مودودی صاحب دو بہنوں کے بیک وقت ایک مرد کے نکاح میں جمع کرنے کو مطلق جائز قرار دیتے ہیں۔ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جسے آخرت کی جوابدہی کا احساس نہ ہو۔ مولانا مودودی صاحب کے جواب میں دو نکتے قابل لحاظ ہیں۔

ایک یہ کہ قانون خداوندی کی رو سے ان توأم لڑکیوں کی فطرت عام عورتوں کی طرح نکاح کی متقاضی ہے۔ اگر ان کو نکاح سے بالکل ہی محروم کر دیا جائے تو یہ ان پر ظلم ہوگا اور اس سے قانون الٰہی پر بھی اعتراض وارد ہوگا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جمع بین الاختین کا حکم اگرچہ عام ہے مگر اس سے مراد وہ دو بہنیں ہیں جو الگ الگ وجود رکھتی ہوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ عام اور کثیر الوقوع حالات کے لیے احکام بیان فرماتا ہے اور شاذ و نادر حالات کو چھوڑ دیتا ہے کہ اہل تفقہ حکم کے منشا کے مطابق اسے خود حل کر لیں گے۔

عصمت انبیاء علیہم السلام دوسرا بنیادی الزام جو مولانا مودودی صاحب پر لگایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ عصمت انبیاء کے منکر ہیں۔ بالخصوص نبوت سے پہلے کے ذرائع علم اور عام لوگوں کے علم میں کوئی فرق نہیں کرتے اور یہ کہ ان کی توحید کیسی ہے۔

ہم یہاں مولانا مودودی صاحب کی عبارات پیش کر رہے ہیں جن سے اس الزام کا جھوٹ ہونا کھل کر سامنے آجائے گا۔

"رسول کی حیثیت شخصی اور حیثیت رسالت اگرچہ اعتبار میں دو جداگانہ حیثیتیں ہیں مگر وجود میں دونوں ایک ہی ہیں اور ان کے درمیان عملاً کوئی فرق ممکن نہیں ہے ———— "منصب رسالت"

دنیوی عہدوں کی طرح نہیں کہ عہدہ دار جب تک اپنے عہدہ کی کرسی پر بیٹھا ہے عہدہ دار ہے اور جب اس سے اترا تو ایک عام انسان ہے۔ بلکہ رسول جس وقت منصب رسالت پر سرفراز ہوتا ہے، اس وقت سے مرتے دم تک وہ ہر وقت اور ہر آن مامور (ON DUTY) ہوتا ہے اور وہ کوئی فعل ایسا نہیں کر سکتا جو اس سلطنت کی پالیسی کے خلاف ہو، جس کا وہ نمائندہ بنا کر بھیجا گیا ہے اس کی زندگی کے معاملات

عام اس سے کہ وہ امام کی حیثیت سے ہوں، یا امیر کی حیثیت سے، قاضی کی حیثیت سے ہوں یا معلمِ اخلاق کی حیثیت سے، ایک شہری اور سوسائٹی کے ایک فرد کی حیثیت سے ہوں یا ایک شوہر، باپ، بھائی، رشتہ دار اور دوست کی حیثیت سے، سب پر اس کی حیثیتِ رسالت اس طرح حاوی ہوتی ہے کہ اس کی ذمہ داریاں کسی حال میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے منفک نہیں ہوتیں حتیٰ کہ جب وہ اپنی خلوت میں، اپنی بیوی کے پاس ہوتا ہے۔ اس وقت بھی وہ اسی طرح اللہ کا رسول ہوتا ہے جس طرح وہ مسجد میں نماز پڑھاتے وقت ہوتا ہے۔

زندگی کے مختلف شعبوں میں وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کی ہدایت کے تحت کرتا ہے۔ اس پر ہر آن اللہ کی طرف سے سخت نگرانی قائم رہتی ہے، جس کے ماتحت وہ انہی حدود کے اندر چلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جو اللہ نے مقرر کر دی ہیں اگر اس کے قدم کو ذرا سی لغزش ہوتی ہے تو اس کو فوراً تنبیہ کی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کی خطا صرف اسی کی خطا نہیں بلکہ ایک پوری امت کی خطا ہے۔۔۔ لہٰذا اس کا خطا اور غلطی سے محفوظ ہونا لازم ہے تا کہ کامل اعتماد کے ساتھ اُس کی پیروی کی جا سکے اور اس کے قول و فعل کو بالکلیہ اسلام کی تعلیم اور اسلامیت کا معیار قرار دیا جا سکے۔" (تفہیمات حصہ اول ص۲۹۰، ص۲۹۱)

یہ اقتباس اپنے مفہوم و مدعا میں بالکل واضح اور مذکورہ بالا الزام کی تردید کے لیے بالکل کافی ہے۔ تاہم چند.... مزید اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"اللہ تعالیٰ نے جب کسی قوم میں نبی بھیجنا چاہا ہے تو خاص طور پر ایک شخص کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ نبوت کی خدمت انجام دے۔ اس کے اندر

انسانیت کی وہ بلند ترین صفات اور وہ اعلیٰ درجہ کی ذہنی و روحانی قوتیں ودیعت کی ہیں جو اس اہم ترین منصب کو سنبھالنے کے لیے ضروری ہیں۔ پیدائش کے وقت سے خاص اپنی نگرانی میں اس کی پرورش اور تربیت کرائی ہے۔ نبوت عطا کرنے سے پہلے بھی اس کو اخلاقی عیوب اور گمراہیوں اور غلط کاریوں سے محفوظ رکھا۔"

(تفہیمات حصہ اول ص ۲۹۲)

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"۔۔۔۔۔ اس طرح جن لوگوں کو پیدا کیا جاتا ہے وہ عام انسانوں کی طرح نہیں ہوتے بلکہ غیر معمولی قابلیتوں کے ساتھ وجود میں آتے ہیں۔ ان کی فطرت انتہائی پاکیزہ ہوتی ہے۔ ان کے ذہن کا سانچہ ایسا ہوتا ہے کہ اس سے جو بات نکلتی ہے سیدھی نکلتی ہے۔ غلط اندیشی اور کج بینی کی استعداد ہی ان میں نہیں ہوتی۔ وہ جبلی طور پر ایسے بنائے جاتے ہیں کہ بلا ارادہ اور بلا کسی غور و فکر کے محض حدس اور وجدان سے ان صحیح نتائج پر پہنچ جاتے ہیں جن پر دوسرے انسان غور و فکر کرنے کے بعد بھی نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ انکے علوم کسبی نہیں، بلکہ جبلی و وہبی ہوتے ہیں۔ حق اور باطل، صحیح اور غلط کا امتیاز ان کی عین سرشت میں ودیعت کیا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

(تفہیمات حصہ اول ص ۲۹۴)

ایک مختصر اقتباس مزید:۔

"در اصل نبوت ایک پیدائشی چیز ہے۔ اور نبی کی حیثیت ذاتی ہی اس کی حیثیت نبوی ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا ہے کہ قبل از بعثت اس کی حیثیت نبوی بالقوۃ ہوتی ہے اور بعد از نبوت بالفعل ہو جاتی ہے" (تفہیمات حصہ اول ص ۳۰۲)

ان واضح عبارات کی موجودگی میں اس الزام کی کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے جسے آخرت کی جوابدہی سے بے پروا ہو کر مولانا مودودی صاحب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے ذرائع علم اور عام لوگوں کے ذرائع علم میں فرق نہیں کرتے رہا یہ کہ نبوت عطا کیے جانے سے پہلے کے علم کو وہ کسبی مانتے ہیں، درج ذیل الفاظ کتنے واضح ہیں :-

"قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ نبی کی ذات بحیثیت مجموعی ایک اُسوہ ہے جس کا ہر پہلو اور رخ ہمیں ہدایت کی روشنی دیتا ہے اور اس ذات کا کوئی فعل اور قول بھی ہوائے نفس یا ضلالت یا غوایت سے ذرہ برابر بھی آلودہ نہیں ہے "

(تفہیمات حصہ اول ص ۲۷۸)

اللہ کے نبی کے بارے میں مزید ایک اصولی وضاحت ملاحظہ ہو :

"رسول" اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیا ہوا فرمانروا ہے۔ اس کی فرمانروائی اس کے منصب رسالت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا رسول ہونا ہی اللہ کی طرف سے اس کا حاکم مطاع ہونا ہے۔ اس کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ اس سے بیعت دراصل اللہ سے بیعت ہے۔ اس کی اطاعت نہ کرنے کے معنی اللہ کی نافرمانی کے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں مقبول نہ ہو ..... پوری امت اور اس کے حکمران سب مل کر بھی قطعاً یہ حق نہیں رکھتے کہ جس معاملہ کا فیصلہ اللہ کا رسول کر چکا ہو اس میں وہ خود کوئی فیصلہ کریں۔"

(سنت کی آئینی حیثیت ص ۸۳ ، ص ۸۴)

" قرآن مجید صاف اور صریح اور قطعاً غیر مشتبہ الفاظ میں رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا معلّم مربی، پیشوا، رہنما، شارح کلام اللہ، شارع (LAW GIVER) قاضی اور حاکم و فرمانروا قرار دے رہا ہے، اور حضورؐ کے یہ تمام مناصب اس کتاب پاک کی رو سے منصب رسالت کے اجزائے لاینفک ہیں۔ کلام الٰہی کی یہی تصریحات ہیں جن کی بنا پر صحابۂ کرامؓ کے دور سے لے کر آج تک تمام مسلمانوں نے بالاتفاق یہ مانا ہے کہ مذکورہ بالا تمام حیثیات میں حضورؐ نے جو کام کیا ہے وہ قرآن کے بعد دوسرا ماخذِ قانون (SOURCE OF LAW) ہے

(سنت کی آئینی حیثیت ص ۸۵)

اہل سنت والجماعت کے نزدیک انبیاء علیہم السلام معاصی اور گناہوں سے معصوم تھے۔ لیکن جہاں تک زلات اور لغزشوں کا تعلق ہے تو اس سے انبیاءؑ معصوم نہیں تھے۔ البتہ زلت اور لغزش کے صدور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہہ ضروری تھی تاکہ امت فعلِ لغزش میں نبی کے اتباع سے محفوظ رہے۔ اس سلسلہ میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ملفوظات میں سے دو عبارات پیش کردی جائیں:

"معصوموں سے اگرچہ قصداً گناہ نہیں ہوسکتا مگر غلط فہمی سے بسا اوقات اُن سے بڑے سے بڑا گناہ ہوجاتا ہے۔"

(۱) ملفوظات شیخ الاسلام حصہ اول ص ۴۷)
شائع کردہ مکتبہ علم و ادب دیوبند

(۲) مکتوبات شیخ الاسلام حصہ اوّل ص ۸۸

دوسری عبارت:۔ "عذاب دیکھنے کے بعد ایمان لانا نفع نہیں دیتا۔ اس

قاعدۂ کلیہ سے صرف قوم یونس علیہ السلام کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ حقیقتاً ان پر عذاب نہیں آیا تھا۔ بلکہ حضرت یونس علیہ السلام کی جلدبازی کی بنا پر صورتِ عذاب نمودار ہو گئی تھی۔"

(ملفوظات شیخ الاسلام حصہ اوّل ص۴۴ مکتوبات شیخ الاسلام حصہ اول ص۹۳)

توہین صحابہؓ کا الزام

ایک اور الزام مولانا مودودی پر یہ لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے صحابہ کرام کی توہین کی ہے اور جھوٹی روایات کی آڑ لے کر ان پر تنقید کی ہے نیز وہ امام ابن تیمیہؒ اور شاہ عبدالعزیز دہلوی جیسے بزرگوں کی تصانیف کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ صحابہ کرام کے بارے میں ان سے دلیل پکڑی جائے۔ مخالفین کے ہاں یہ الزام سب سے زیادہ زوردار سمجھا جاتا ہے اور اسے ہر جگہ بیان کرنا ضروری خیال کیا جاتا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ بھی منجملہ ان جھوٹے اور من گھڑت الزامات میں سے ایک ہے جو مولانا مودودی پر نہ معلوم کن وجوہات کی بنا پر لگائے جاتے ہیں۔ ہمارے پاس اس الزام کے جھوٹا ہونے کے دلائل یہ ہیں۔

۱۔ "یہاں اس امر پر بھی متنبہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت (سورۂ حج کی آخری آیت) منجملہ ان آیات کے ہے جو صحابہ کرامؓ کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں۔ اور ان لوگوں کی غلطی ثابت کرتی ہیں جو صحابہ پر زبان طعن دراز کرتے ہیں ....." (تفہیم القرآن سورہ حج حاشیہ ص۱۲۹)

۲۔ صحابہ کرامؓ کو برا بھلا کہنے والا میرے نزدیک صرف فاسق ہی نہیں ہے بلکہ اس کا ایمان بھی مشتبہ ہے۔

من البغضهم فببغضی البغضهم (ترجمان القرآن اگست ۷۱ء صـ۵۳)

۳۔ صحابی کی تعریف میں اگرچہ سلف میں اختلاف ہے مگر حضرت معاویہؓ کو ہر تعریف کے لحاظ سے شرفِ صحابیت حاصل ہے۔ آپ کے بعض انفرادی افعال محلِ نظر ہو سکتے ہیں، مگر بحیثیت مجموعی اسلام کے لیے آپ کی خدمات مسلّم اور ناقابلِ انکار ہیں۔ اور آپ کی مغفرت ایک یقینی امر ہے۔ (مقام صحابہ صـ۱۲۲)

صحابہ کرام کے سلسلۂ بیان میں ایک اہم اور نازک پہلو "مشاجرات صحابہ" کا بھی آتا ہے۔ اس ضمن میں دوسرے علماء محققین سلف و خلف کی طرح مولانا مودودی صاحب نے بھی اپنا ایک تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان کے اس تجزیہ سے علمی اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے توہین صحابہ کا پہلو برآمد کرنا صحیح نہیں ہے۔

اس سلسلے میں مولانا مودودی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے ائمہ اہل سنت اور اصحاب تاریخ دیر کم و بیش اسی قسم کی باتیں لکھتے چلے آئے ہیں۔ اس کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن طوالت سے بچنے کے لیے چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے:۔

امام ابن تیمیہؒ منہاج السنہ میں لکھتے ہیں:۔

۱۔ "حضرت عمرؓ نے لوگوں کو مال سے آسودہ نہ کیا اور نہ اپنے کسی رشتہ دار کو کوئی عہدہ دیا یہ ایسی بات ہے جسے ہر ایک جانتا ہے۔ رہے حضرت عثمانؓ تو انہوں نے سکونِ قلب، بردباری، راست روی اور رحمت و کرم کے ساتھ اس نظام کو چلایا جو ان سے پہلے قائم ہو چکا تھا۔ مگر ان میں نہ حضرت عمرؓ جیسی قوت تھی، نہ ان کی سی سیاست۔ نہ اس درجہ کا کمال عدل وزہد۔ اس سے بعض لوگوں نے ان سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور وہ دنیا کی طلب میں منہمک ہو

گئے اور ان میں خدا اور خلیفہ کا خوف کمزور پڑ گیا۔ پس حضرت عثمانؓ کی کمزوری نے، اور ان کے اقارب کو جو مناصب اور مال حاصل ہوئے تھے، انہوں نے فتنے کو جنم دیا حتیٰ کہ آپ مظلومی کی حالت میں شہید ہو گئے۔"

(منہاج السنہ جلد چہارم ص۱۲۱ مطبوعہ مصر)

حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی ازالۃ الخفا میں تحریر فرماتے ہیں۔

۲۔ "حضرت عثمان ذوالنورین کی سیرت حضرات شیخینؓ کی سیرت سے مغایر و مختلف تھی کیونکہ حضرت عثمانؓ بعض اوقات عزیمت کے بجائے رخصت پر اتر آئے تھے اور آپ کے امراء میں شیخینؓ کے امراء و عمال جیسی صفات نہ تھیں۔"

(ازالۃ الخفا مقصد اول ص۱۵۰)

فتاویٰ عزیزیہ میں شاہ عبدالعزیز دہلوی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

۴۔ علماء ماوراالنہر، مفسرین اور فقہا کہتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کی حرکات جنگ و جدل جو حضرت علی مرتضیٰ کے ساتھ ہوئیں، وہ صرف خطاء اجتہادی کی بنا پر تھیں۔ محققین اہل حدیث نے بعد تتبع روایات دریافت کیا ہے کہ یہ حرکات شائبۂ نفسانی سے خالی نہ تھیں۔ اور اس تہمت سے خالی نہیں کہ جناب ذوالنورین حضرت عثمانؓ کے معاملہ میں جو تعصب امویہ و قریشیہ میں تھا، اسی کی وجہ سے یہ حرکات امیر معاویہؓ سے وقوع میں آئیں جس کا غایت نتیجہ یہی ہے کہ وہ مرتکب کبیرہ و بغاوت قرار دیئے جائیں۔ ۔ ۔ ۔ لیکن وہ قابل لعن نہیں۔

(فتاویٰ عزیزیہ ص۲۲۵، شائع کردہ۔ سعید اینڈ کمپنی، کراچی)

مولانا رشید احمد گنگوہی شیعہ حضرات کے ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں :-

۴۔ معاویہؓ کا محاربہ حضرت امیرؓ کے ساتھ جو ہوا تو اہل سنت اس کو کب بھلا اور جائز کہتے ہیں۔ ذرا کوئی کتاب اہل سنت کی دیکھی ہوتی۔ اہل سنت ان کو اس فعل پر خاطی کہتے ہیں۔ مگر معاویہؓ اس خطا کے سبب ایمان سے نہیں نکل گئے۔ جیسا تمہارا اور تمہارے اسلاف کا زعم ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ خود قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ وان طائفتان من المومنین اقتتلوا.... تو دیکھو کہ حق تعالیٰ باوصف مقاتلہ باہمی ان کو مومنین کہہ کر تعبیر فرماتا ہے اور سوا اس کے صدہا آیات ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ فسق و گناہِ کبیرہ سے مسلمان کافر نہیں ہوتا۔"

(ہدایت الشیعہ صـ ۳)

تقلید کا مسئلہ ایک الزام مولانا مودودی صاحب پر یہ لگایا جاتا ہے کہ وہ تقلید کے مخالف ہیں اور صاحب علم لوگوں کے لیے تقلید کو گناہ سے بھی شدید تر چیز قرار دیتے ہیں جس کا مطلب کفر ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا مودودی صاحب کا موقف اور بعض دوسرے محققین امت کی آراء درج ذیل ہیں۔

"جو شخص خود احکام الٰہی اور سنن نبوی میں نظر بالغ نہ رکھتا ہو اور خود اصول سے فروع کے استنباط کا اہل نہ ہو، اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ علماء اور ائمہ میں سے جس پر اسے اعتماد ہو اس کے بتائے ہوئے طریقہ کی پیروی کرے۔ اگر کوئی شخص اس حیثیت سے ان کی پیروی کرتا ہے تو اس پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔"

(رسائل و مسائل جلد اول صـ ۲۳۵)

صاحب علم آدمی کے لیے مولانا اس طرح کی تقلید کے بجائے یہ چاہتے ہیں کہ وہ براہ راست کتاب و سنت سے صحیح حکم معلوم کرنے کی کوشش کرے اور سلف کی

آراء سے بھی مدد لے۔ اس کے بعد جو کچھ اسے حق معلوم ہو اسی کی پیروی کرے
چنانچہ لکھتے ہیں :۔

"صاحب علم آدمی جو کتاب وسنت اور احکام الٰہی میں نظر بالغ رکھتا ہو وہ براہ راست کتاب وسنت سے حکم صحیح معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ اور اس تحقیق میں وہ علمائے سلف کی آراء سے بھی مدد لے۔ نیز اختلافی مسائل میں جو آئمہ کے مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں، ہر تعصب سے پاک ہو کر کھلے دل سے تحقیق کرے کہ ائمہ مجتہدین میں سے کس کا اجتہاد کتاب وسنت سے زیادہ موافقت رکھتا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ حق معلوم ہو اس کی پیروی کرے۔" (رسائل ومسائل جلد اول ص ۲۳۵)

"میں اصل میں تو صرف ایک امام کا پیرو ہوں جن کا نام نامی محمدؐ رسول اللہ ہے۔ البتہ فقہی مسائل میں میرا طریقہ یہ ہے کہ جس مسئلہ کی تحقیق کا مجھے موقع نہیں ملتا اس میں امام ابو حنیفہؒ کی پیروی کرتا ہوں، کیونکہ ان کے مذہب کے اکثر مسائل کو میں نے اپنے اصلی امام کی تعلیم کے زیادہ موافق پایا ہے۔ مگر جس مسئلہ میں مجھے تحقیق کا موقع ملتا ہے اس میں چاروں اماموں کے مذاہب پر نظر ڈالتا ہوں اور جس کی تحقیق کو قرآن و حدیث کے منشاء سے زیادہ قریب پاتا ہوں اس کی پیروی کرتا ہوں۔"

(ترجمان القرآن ج ۳۰ عدد ۱، ۲، ص ۱۱۹)

یہ ہے وہ نظریہ جس کی بنا پر وہ حضرات جن کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ مولانا مودودی صاحب کو تقلید کا منکر اور گناہ سے شدید تر بنا کر کفر تک لے جانا چاہتے ہیں حقیقت میں یہ نظریہ وہی رکھ سکتا ہے جو تقلید سے ہٹنے کو اصل دین سے ہٹنے کے ہم معنی سمجھتا ہو۔ ورنہ مولانا مودودی صاحب کا نظریہ نہایت متوازن،

معقول اور قابل عمل ہے۔

تقلید کے بارے میں امام ابن تیمیہؒ کی رائے ملاحظہ ہو!

"جو شخص استدلال کی قدرت رکھتا ہو" بعض علماء کہتے ہیں کہ اس میں تقلید مطلقاً حرام ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ مطلقاً جائز ہے۔ اور بعض کے نزدیک صرف بوقت ضرورت جائز ہے۔ مثلاً یہ کہ وقت میں اتنی گنجائش نہ ہو کہ تحقیق کر کے دلیل سے مسئلہ کا استنباط کر سکے یہی قول سب سے زیادہ معتدل ہے۔"

(فتاویٰ امام ابن تیمیہ ج ۲ ص ۳۸۴)

امام ابن حزمؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی رائے تقلید کے بارے میں درج ذیل ہے۔

امام ابن حزم کا یہ فتویٰ کہ تقلید حرام ہے "اس شخص کے حق میں درست ہے جو اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اگرچہ ایک ہی مسئلہ میں کیوں نہ ہو۔ اور اس شخص کے بارے میں بھی درست ہے جس پر اچھی طرح یہ حقیقت واضح ہو چکی ہو کہ حضورؐ نے اس معاملہ میں اسطرح حکم دیا ہے یا نہی فرمائی ہے یا یہ کہ فلاں حکم منسوخ ہے ابن حزم کا یہ فتویٰ اس آدمی کے حق میں بھی درست ہے جو مذہبی تعصب کی وجہ سے یہ جائز ہی نہ سمجھے کہ کوئی حنفی، شافعی سے یا شافعی حنفی سے دین کا کوئی مسئلہ پوچھے یا ایک دوسرے کے پیچھے اقتداء کرے۔ اس طرح کی تقلید قرونِ اولیٰ کے اجماع کے خلاف اور صحابہ و تابعین کے طرز کی ضد ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۳۶۳ - ص ۳۶۵)

ابن حزم ظاہریؒ اور بعض دوسرے فقہا کا تقلید کے بارے میں یہ فتویٰ تھا کہ "ائمہ مجتہدین میں سے کسی امام کی تقلید بھی اس کے تمام اقوال میں جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔" حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ابن

حزم وغیرہ علماء کا یہ فتویٰ اگرچہ مطلقاً قابل تسلیم نہیں ہے تاہم چار قسم کے لوگ ایسے ہیں جن کے حق میں صحیح اور درست ہے اور ان کے لیے تقلید حرام ہے:-

ایک وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے قوت اجتہاد عطا فرمائی ہو۔ دوسرا وہ آدمی جسے واضح طور پر یہ معلوم ہوا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ امام مذہب کے اجتہادی فیصلہ کے خلاف ہے۔ تیسرا وہ آدمی ہے جو عامی ہو اور کسی ایک امام کی تقلید اس عقیدے کے ساتھ کرتا ہو کہ اس سے خطا سرزد نہیں ہوتی۔ نیز یہ نظریہ بھی رکھتا ہو کہ اپنے مسلک کے خلاف چاہے مجھے حدیثیں بھی مل جائیں مگر اپنے امام کی تقلید نہیں چھوڑوں گا۔ چوتھا وہ آدمی جو مذہبی تعصب میں اس قدر مبتلا ہو کہ دوسرے مسلک کے علماء سے دینی مسائل دریافت کرنا جائز ہی نہ سمجھتا ہو اور ان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہ سمجھتا ہو۔ ان چار قسم کے لوگوں کے لئے حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے بھی ابن حزم کے فتویٰ کے ساتھ اتفاق کیا ہے اور ان لوگوں کے لیے تقلید کو ناجائز قرار دیا ہے۔

بزرگان سلف کے تقلید کے بارے میں ان اقوال کے ہوتے ہوئے جو لوگ مولانا مودودی صاحب کی مذکورہ بالا نہایت متوازن رائے پر اعتراض کرتے ہیں ان کے معاملے کو ہم اللہ پر چھوڑتے ہیں۔

ایک اعتراض مولانا مودودی صاحب پر یہ کیا جاتا ہے

سجدۂ تلاوت کہ انہوں نے سجدۂ تلاوت کو بے وضو جائز قرار دیا ہے۔ اور اس طرح پوری امت سے الگ راستہ اختیار کیا ہے جو کسی حق پسند عالم کو زیب نہیں دیتا وغیرہ: اس اعتراض کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے سب سے پہلے مولانا

محترم کا موقف درج کیا جائے گا اور پھر صحابہ رضؓ کرام کی روایات درج کی جائیں گی۔
تفہیم القرآن جلد دوم سورہ اعراف کے آخر میں جہاں پہلا سجدہ تلاوت آتا ہے اس مقام پر مولانا مودودی صاحب نے درج ذیل تفسیری نوٹ دیا ہے!

"اس سجدے کے لیے جمہور انہیں شرائط کے قائل ہیں جو نماز کی شرطیں ہیں یعنی باوضو ہونا۔ قبلہ رخ ہونا اور نماز کی طرح سجدے میں زمین پر سر رکھنا۔ لیکن جتنی بھی احادیث سجدہ تلاوت کے باب میں ہم کو ملی ہیں ان میں کہیں ان شرطوں کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ ان سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آیت سجدہ سن کر جو شخص جہاں جس حال میں ہو جھک جائے۔ خواہ وہ باوضو ہو یا نہ ہو۔۔۔ سلف میں بھی ہم کو ایسی شخصیتیں ملتی ہیں جنکا عمل اس طریقے پر تھا۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ ابن عمر رضؓ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ وضو کے بغیر سجدہ تلاوت کرتے تھے اور ابو عبدالرحمٰن سلمی کے متعلق فتح الباری میں لکھا ہے کہ وہ راستہ چلتے ہوئے قرآن مجید پڑھتے جاتے تھے اور اگر کہیں آیت سجدہ آجاتی تو بس سر جھکا لیتے تھے، خواہ باوضو ہوں یا نہ ہوں۔۔۔۔ ان وجوہ سے ہم سمجھتے ہیں کہ اگرچہ زیادہ مبنی بر احتیاط مسلک جمہور ہی کا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص جمہور کے مسلک کے خلاف عمل کرے تو اسے ملامت بھی نہیں کی جا سکتی کیونکہ جمہور کی تائید میں کوئی سنت ثابتہ موجود نہیں، اور سلف میں ایسے لوگ پائے گئے ہیں جن کا عمل جمہور کے مسلک سے مختلف تھا۔

(تفہیم القرآن جلد دوم ص۱۱۶)

امام بخاریؒ نے باب سجود المسلمین مع المشرکین کے ترجمۃ الباب میں ذکر کیا ہے کہ "۔۔۔ اور عبداللہ ابن عمر وضو کے بغیر بھی سجدہ تلاوت کرتے تھے۔"

"سجدۂ تلاوت کے لیے امام شعبیؒ اور امام بخاریؒ کے نزدیک وضو شرط نہیں ہے۔ چنانچہ اسی غرض کے لیے امام بخاریؒ نے ابن عمرؓ کا یہ اثر نقل کیا ہے کہ" وضو کے بغیر بھی وہ سجدہ تلاوت کرتے تھے۔"

(عرف الشذی دروس ترمذی حضرت انور شاہ صاحب۔ کاشمیریؒ (ج ۱ صـ ۸)

یہ ہے اس مسئلے کی حقیقت جسے اتنا بھیانک بنا کر مودودی صاحب کے خلاف ناراضی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کسی مسئلے پر گفتگو کی جائے گی تو اس کے ہر پہلو کو بیان کیا جائیگا۔ یہاں مولانا محترم نے پہلے جمہور کی رائے بیان کی ہے کہ وہ انہی شرائط کے قائل ہیں جو نماز کی شرائط ہیں۔ اس کے بعد دوسرا مسلک جو جمہور نے تو نہیں لیکن بعض صحابہؓ نے اختیار فرمایا اور اس پر عمل کیا اس کو بیان کر دیا۔

رہے مولانا مودودی صاحب کے اندھے مخالفین جن کے سینوں میں ان کے خلاف بغض و عناد کی بھٹیاں سلگ رہی ہیں، تو انہیں سمجھانا ہماری استطاعت سے باہر ہے اس لیے ان کا معاملہ اللہ کے حوالے۔ وہ جب تک چاہیں اپنی صلاحیتیں اور اوقات اس "کارِ خیر" میں صرف کرتے چلے جائیں۔ ہم ان سے تعرض نہیں کرتے۔

امریکی سامراج کا ایجنٹ ہونے کا الزام

ایک بہت بڑا الزام مولانا مودودی صاحب پر یہ لگایا جاتا ہے کہ وہ امریکی سامراج کے ایجنٹ ہیں۔ یہ الزام اس شخص پر لگایا جا رہا ہے جو آج تک اپنا مکان تک نہیں بنوا سکا اور کرایہ کے مکان میں رہائش رکھتا ہے، یعنی جس کا نہ کوئی مکان، نہ کوئی دکان اور نہ اور کسی قسم کی کوئی جائداد ہے۔ بہرحال اس صریح افتراء، بہتان اور معترضین کے اس جھوٹے پروپیگنڈا

کی حقیقت کو نشت از بام کرنے کے لیے ذیل میں چند اقتباسات دیئے جارہے ہیں ملاحظہ ہوں :-

ایک مختصر سا بیان ۹ ر اکتوبر ۱۹۶۹ء کے نوائے وقت کے پہلے صفحے پر شائع ہوا۔ سرخی تھی۔

"ہمیں اپنے ملک سے امریکہ کو نکال دینا چاہیئے"

دوسری سرخی تھی۔

"بیت المقدس اور فلسطین کی بازیابی کے لیے یہودی اداروں اور امریکہ دونوں کا بائیکاٹ ضروری ہے۔"

جولائی ۱۹۶۹ء میں امریکی خلاباز جب چاند پر اترے۔ اس پر مولانا مودودی صاحب کا جو بیان اخبارات میں چھپا ہے اسے بھی نوائے وقت مورخہ ۲۳ ر جولائی کے حوالے سے ملاحظہ فرمائیں۔

"دین حق کی رہنمائی کے بغیر سائنسی ترقی تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔"

"امریکہ مادی ترقی کے باوجود اخلاقی مسائل حل کرنے میں ناکام رہا ہے۔"

...... جس امریکہ نے اپنے سائنسی کمالات کی بدولت آدمی کو چاند پر پہنچا دیا ہے اس ملک میں اس وقت رنگ و نسل کی بنیاد پر انسانوں کو تقسیم کیا جاتا ہے اور کالے رنگ والوں کو وہاں انسانی حقوق تک میسر نہیں آتے اور امریکہ میں لاکھوں بھوک سے مر رہے ہیں ...... "

جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل اور عرب ریاستوں کے درمیان جو معرکہ ہوا تھا اس کے بارے میں مولانا مودودی صاحب نے ایک مفصل بیان دیا تھا جس کا مکمل متن

جولائی ۱۹۶۷ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہو چکا ہے اور اس کا عربی ترجمہ عربی اخبارات الشہاب اور المدینہ وغیرہ میں چھپا تھا۔ اردو اخبارات میں بھی اس کا خلاصہ شائع ہوا تھا۔ یہاں ترجمان القرآن کے مذکورہ پرچے کے حوالہ سے اس بیان کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

...... "امریکہ پر خصوصیت کے ساتھ یہودی کچھ اسطرح چھا گیا ہے جیسے کسی آدمی پر جن سوار ہو جائے۔ امریکی پریس، خبر رساں ایجنسیوں اور مالیات پر یہ قوم پوری طرح مسلط ہے اور یہودی ووٹوں کی طاقت اتنی زبردست ہے کہ امریکہ کے صدر سے لیکر کانگریس کے ممبروں تک، سب اپنی کامیابی کے لیے ان کے محتاج ہیں۔ ان حالات میں اگر امریکہ کو یہودیوں کی خاطر تمام دنیا کے عربوں اور مسلمانوں کو قربان بھی کر دینا پڑے تو وہ اس کی کوئی پروا نہ کرے گا...... یہی وجوہ ہیں جن کی بنا پر اسرائیل کے روزِ پیدائش سے مغربی دنیا نے بالعموم اور امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے بالخصوص اس کو زیادہ سے زیادہ طاقتور بنانے کی کوشش کی ہے۔"

...... "پھر معاملہ اسی حد تک نہیں رہا۔ بلکہ عین اس جنگ سے پہلے بحرِ روم اور بحرِ احمر میں برطانیہ اور امریکہ کے کئی طیارہ بردار جہاز عربوں کے سر پر پہنچ گئے اور انھوں نے اسرائیل کی فضائی حفاظت کا کام اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی پوری ہوائی طاقت کو اس غرض کے لیے آزاد کر دیا کہ وہ عرب ملکوں اور ان کی فوجوں پر تاخت کرنے کے لیے وقف ہو جائے۔"

بیان کے آخر میں مولانا مودودی صاحب نے نو تجاویز بھی پیش فرمائی ہیں جن میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مسلم سربراہوں کو یو۔ این۔ او وغیرہ مغربی اثرات کے زیر اثر اداروں پر بھروسہ کرنے کے بجائے ایک مسلم بلاک اور اتحاد کی بنیاد رکھنی چاہیے۔

ان تجاویز کے بعد بیان ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے :-

"یہ وہ کم سے کم امور ہیں جن کے لیے مسلمان ریاستوں کے سربراہوں کا اجتماع وقت کی اہم ترین ضرورت ہے ..... اس وقت مسلمان ملکوں میں سے اگر کوئی ملک اس معاملہ میں پیش قدمی کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے تو وہ پاکستان ہی ہے۔ خدا کے فضل سے عرب ریاستیں بھی اس کو اپنا سب سے زیادہ ہمدرد و خیر خواہ سمجھتی ہیں اور غیر عرب ریاستوں میں بھی وہی سب سے زیادہ ان سے قریب تر ہے"

مسجد اقصیٰ میں آتش زنی کے دلخراش واقعہ کے موقعہ پر مولانا مودودی صاحب نے ۲۴ اگست ۱۹۶۹ء کو مرکز جماعت اسلامی لاہور میں کارکنان جماعت اسلامی کے ایک ہنگامی اجتماع میں تقریر فرمائی۔ اس تقریر کا خلاصہ تمام اخبارات میں شائع ہوا اور اس کا عربی ترجمہ عربی اخبارات میں شائع ہوا۔ ستمبر ۶۹ء کے ترجمان القرآن میں اشارات کی جگہ اس تقریر کا مکمل متن شائع کیا گیا ہے اور الگ پمفلٹ کی شکل میں بھی چھاپ دیا گیا ہے۔ اس تقریر کا وہ حصہ جو امریکہ کی مذمت پر مشتمل ہے اس کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے :-

"نومبر ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فلسطین کو یہودیوں اور عربوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ یہ فیصلہ ہوا کس طرح ؟ اس کے حق میں ۳۳ ووٹ اور اس کے خلاف ۱۳ ووٹ تھے (دس ملکوں نے کوئی ووٹ نہیں دیا) یہ کم سے کم اکثریت تھی جس سے جنرل اسمبلی میں کوئی ریزولیوشن پاس ہو سکتا تھا۔ چند روز پہلے تک اس تجویز کے حق میں اتنی اکثریت بھی نہ تھی۔ صرف ۲۰ ملک اس کے حق میں تھے۔ آخر کار امریکہ نے غیر معمولی دباؤ ڈال کر ہائیٹی، فلپائن اور لائیبریا کو مجبور کر کے اسکی تائید کرائی ..... اور جیمز فورریسٹال اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ " اس معاملہ میں

دوسری قوموں پر دباؤ ڈالنے اور ان کو ووٹ دینے پر مجبور کرنے کے لیے جو طریقے استعمال کئے گئے وہ شرمناک کارروائی کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں۔"

"۱۹ برس کی اس مدت میں امریکہ نے اسرائیل کو ایک ارب ۶۰ کروڑ ڈالر کی مالی امداد دی.... جنگی حیثیت سے اس کو ز فرق تا بقدم اس قدر مسلح کر دیا گیا کہ جون ۶۷ کی جنگ سے پہلے ہی امریکی ماہرین کا یہ اندازہ تھا کہ وہ صرف چار یا پانچ دن کے اندر اپنے گرد و پیش کی تمام عرب ریاستوں کو پیٹ لے گا۔ سیاسی حیثیت سے ہر موقع پر امریکہ اور اس کے ساتھی اس کی پشت پناہی کرتے رہے اور انہی کی حمایت کی وجہ سے اقوام متحدہ اس کی پے در پے زیادتیوں کا کوئی تدارک نہ کر سکی۔"

"امریکہ کی دلچسپی اسرائیل کے ساتھ کتنی بڑھی ہوئی ہے، اس کو جاننے کے لیے آپ ذرا اس رویئے پر نگاہ ڈال لیں جو جون ۶۷ء کی جنگ کے موقع پر اس نے اختیار کیا۔ جنگ سے ایک ہفتہ پہلے امریکی فوج کے جوائنٹ چیفس آف سٹاف کے صدر جنرل وہیلر نے صدر جانسن کو اطمینان دلایا تھا کہ اگر اسرائیل بڑھ کر پہلے ایک کامیاب ہوائی حملہ کر دے تو پھر زیادہ سے زیادہ تین چار دن کے اندر وہ عربوں کو مار دے گا۔ لیکن اس رپورٹ پر بھی جانسن صاحب پوری طرح مطمئن نہ ہو سکے اور انہوں نے سی آئی اے کے چیف رچرڈ ہیلمس سے رپورٹ طلب کی۔ جب اس نے بھی وہیلر کے اندازوں کی توثیق کر دی تو جانسن صاحب نے روس سے رجوع کر کے یہ اطمینان حاصل کیا کہ وہ عربوں کی مدد کے لیے عملاً کوئی مداخلت نہ کرے گا۔ اس کے بعد کہیں جا کر اسرائیل پر "وحی نازل" ہوئی (اس پر یہ حاشیہ درج ہے۔ وحی نازل ہوئی کے لفظ پر چونکیے نہیں۔ شیطان بھی اپنے اولیاء پر "وحی" کیا کرتے ہیں) کہ اب عرب ملکوں پر حملہ

کر دینے کا مناسب وقت آ گیا ہے۔ اس پر بھی امریکہ کا چھٹا بحری بیڑہ مصر اور اسرائیل کے سواحل کے قریب اپنی پوری طاقت کے ساتھ مستعد کھڑا تھا تاکہ بوقت ضرورت کام آ سکے۔

جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کی قراردادیں اور مولانا مودودی صاحب کے بیانات اور مضامین اس سے کہیں زیادہ ہیں جن میں امریکہ کی مذمت کی گئی ہے ان اقتباسات سے قارئین یہ سمجھ سکتے ہیں کہ امریکی حمایت اور ایجنسی کا جو الزام جماعت اسلامی اور اس کے امیر پر لگایا جاتا ہے وہ ایک بہتان اور افترا سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

(یہ مضمون ۸ فروری ۷۰ء کے "ایشیا" میں شائع ہو چکا ہے)

ابوالاعلیٰ

- ابوالاعلیٰ نام کا تاریخی پس منظر
- ابوالاعلیٰ کے لغوی معنی
- قرآن میں الاعلیٰ ، کا استعمال
- اُردُو میں لفظ اعلیٰ ، کا استعمال
- " ابو" کے معنی اور عربی میں اس کا استعمال
- ابوالاعلیٰ کے معنی

سید المشائخ حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ (۴۳۰ - ۵۲۷ھ) تمام سلاسل چشتیہ ہند کے شیخ الشیوخ اور مودودی خاندان کے مورث اعلیٰ ہیں حضرت علی ہجویریؒ معروف بہ داتا گنج بخش جس زمانے میں طالب علم تھے اور تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کر رہے تھے، خواجہ مودود چشتیؒ کے علم و فضل اور زہد و ورع کی شہرت کا سورج نصف النہار پر تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ متحدہ ہند و پاکستان کے اولیائے کرام اور مبلغین اسلام میں اولیت کے ساتھ ساتھ نہایت ممتاز مقام رکھتے ہیں، اور تصوف میں آپ کو امامت کا درجہ حاصل ہے۔ خواجہ مودود چشتی ان کے دادا پیر تھے خواجہ اجمیریؒ کے شیخ حضرت عثمان ہرونیؒ تھے۔ ان کے شیخ حضرت حاجی شریف زندنیؒ تھے اور ان کے شیخ حضرت خواجہ قطب الدین مودودؒ تھے۔

حضرت خواجہ مودود چشتی کے بعد گیارہویں پشت میں ایک بزرگ گزرے ہیں جن کا نام ابوالاعلیٰ تھا۔ اور السید العلامہ منتخب الدین شاہ ابوالاعلیٰ جعفر کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ آپ اپنے زمانہ کے نامور بزرگ تھے اور ممتاز ترین علماء میں شمار ہوتے تھے جیسا کہ آپ کے نام کے سوابق ہی سے ظاہر ہو رہا ہے۔ زہد و ورع میں یگانۂ روزگار تھے۔ ۹۱۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ موصوف مودودی خاندان کے پہلے بزرگ تھے جنہوں نے ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ سکندر لودھی کے زمانے میں چشت سے ہندوستان آئے اور کرنال کے قریب قصبہ براس میں مقیم ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانے میں آپ کا خاندان مستقلاً دہلی میں آکر آباد ہو گیا تھا۔

شاہ ابوالاعلیٰ جعفر مودودیؒ کی تیرھویں پشت میں سید احمد حسن کے ہاں ۱۹۰۳ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ سید صاحب مرحوم و مغفور نے نومولود کا نام رکھنے کے بارے میں مشورہ کیا۔ ایک بزرگ نے شاہ ابوالاعلیٰ کے نام پر تبرکاً ابوالاعلیٰ نام تجویز کیا۔ والدین اور دوسرے اعزہ نے اس نام کو پسند کیا اور بچے کا نام ابوالاعلیٰ رکھ دیا گیا۔

آج وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نام سے نہ صرف ہندو پاکستان میں بلکہ تمام اسلامی دُنیا میں مفکرِ اسلام، مفسرِ قرآن اور مسلم رہنما کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ موصوف نصف صدی سے اسلامی تعلیمات کی اشاعت، اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامتِ دین کی مسلسل اور انتھک جدوجہد کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس راہ کی تمام مشکلات، مصائب اور رکاوٹوں کو انگیز کر چکے ہیں اور اس میدان کے اس حد تک شہسوار ثابت ہوئے کہ تختہ دار صرف ایک قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شہرت، اسلام کی صحیح اور دل میں اتر جانے والی ترجمانی، زورِ استدلال، وسعت پکڑتا اور پھیلتا ہوا ہر شعبہ زندگی کے مسائل پر حاوی لٹریچر اور اس کے ساتھ ایک منظم، فعال اور معاملہ فہم تحریک — جماعت اسلامی —— کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر ملحدین، متشککین، مذبذبین اور بعض دوسرے گروہوں کو پریشانی لاحق ہوئی۔ چنانچہ سب سے پہلے مرزائیوں نے مولانا مودودی کے خلاف اپنے پرچوں میں باقاعدہ لکھنا شروع کیا اور آج تک لکھتے جا رہے ہیں۔ دوسرے نمبر پر منکرین حدیث و سنت نے مولانا محترم کو بدنام کرنے اور آپ سے عوام کی توجہ کو ہٹانے کے لیے آپ کی عبارتیں سیاق و سباق سے کاٹ کر اور انہیں من مانا

مفہوم پہنا کر پیش کرنا شروع کیا۔ چنانچہ ۲۰ - ۲۵ سال سے وہ یہی کچھ کرتے چلے آرہے ہیں۔ "طلوع اسلام" کے فائل گواہ ہیں کہ چوتھائی صدی کی اس طویل مدت میں شاید ہی کوئی پرچہ ایسا مل سکے جس میں مولانا مودودی صاحب پر کرم نہ فرمایا گیا ہو۔

ایک تیسرا گروہ چند ایسے حضرات پر مشتمل ہے جو کانگریس سے وابستہ تھا۔ اُسی کے لیے کام کرتا تھا ——— اسی کی کامیابی میں اپنی اور مسلمان قوم کی فلاح تصور کرتا تھا اور اس مقصد کے لیے متحدہ قومیت کا علمبردار تھا۔ مولانا مودودی صاحب نے مسئلہ قومیت لکھ کر ان کے غلط موقف کی جو قلعی کھول لی اور "ہندو مسلم ایک قوم" کے تصور کے مقابلے میں **اسلامی قومیت** کی حقیقت ثابت کرتے ہوئے براہین و استدلال سے کانگریس کے بڑے بڑے ہمنوا مشائخ کو لاجواب کر دیا، تو ۳۸ء ۳۹ء ہی سے ان حضرات کے وابستگان نے مولانا محترم کے خلاف اپنے دل میں گرہ ڈال لی تھی اور آہستہ آہستہ مخالفت کے اسی راستے پر آگئے جس پر بعض دوسرے گروہ پہلے کام کر رہے تھے۔

اب یہ تینوں محاذ دن رات اندھا دھند گولہ باری کر رہے ہیں۔ مذہب اور سیاست میں اختلافی مسائل سے گزر کر الزامات۔ اتہامات، اختراعات، بہتانات وغیرہ میں سے کسی میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی گئی۔ ایسے ایسے گھناؤنے اور من گھڑت واقعات اُن کی طرف منسوب کئے گئے کہ شرافت بھی پانی پانی ہو کر رہ گئی۔ اگرچہ ان تمام الزامات کی کوئی حد نہیں تھی اور ان سب کا احاطہ کرنا کارِ دشوار تھا لیکن اس کے باوجود ہر اعتراض کا ایک اصولی جواب نمبروار دے دیا گیا تھا۔ اس پر مخالفین نے یہ تکنیک اختیار کی کہ ہر بہتان کو اس طرح دہراتے رہو جیسے اس کا کوئی جواب دیا ہی

نہیں گیا۔ آج کل وہ اسی تکنیک پر عمل پیرا ہیں۔

مولانا مودودی صاحب کے ساتھ ان کے معاندین کی عداوت کیشی اس حد تک پہنچ چکی ہے جیسے آتش فشاں پہاڑ میں آتشیں لاوا پک پک کر بہنے لگا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اب الزامات لگانے کے لیے وہ کسی بنیاد، سہارے یا معقولیت کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ اس کی ایک مثال وہ اعتراض ہے جس پر ہم گفتگو کر رہے ہیں

وہ کہتے ہیں "الا علیٰ" اللہ کا نام ہے، اس لیے ابوالاعلیٰ کے معنے ہوئے اللہ کا باپ" (نعوذ باللہ) ـــــ یہ بات کہہ کر یہ مخالفین پکارنا شروع کر دیتے ہیں کہ "لوگو! دیکھو مودودی اپنے آپ کو اللہ کا باپ کہلاتا ہے اور ظاہر ہے اس سے بڑی گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے۔ (یہ ہے وہ اعتراض جو علماء اور مشائخ کہلوانے والوں کی طرف سے دہرایا جا رہا ہے) ہم اس حقیقت کو یہاں کھول رہے ہیں اور اسی سے اندازہ کیا جا سکے گا کہ تفہیم القرآن کے مؤلف کی تنقیص کرنیوالوں کے علم و عقل اور دیانت کیا حال ہے۔

علمی لحاظ سے دیکھا جائے تو افراد کے ناموں کے بارے میں علماء کا موقف یہ ہے کہ نام محض علامت اور پہچان کے لیے ہوتے ہیں ان کے معانی بیان کرنا اور پھر ان پر تنقید کرنا درست نہیں ہے۔ الا یہ کہ کوئی نام ایسا ہو جو کفر و شرک کی ترجمانی کر رہا ہو تو البتہ اسے بدلنا ضروری ہو گا۔ حضرت ابوہریرہؓ کا نام عبدالشمس تھا۔ حضور ؐ نے اسے عبدالرحمٰن سے بدل دیا۔ لیکن آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ نے جو غلام آپؐ کو عطا فرمایا تھا اس کی کنیت ابورافع تھی، رافع اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں میں سے ایک ہے اور اس کے ساتھ "ابو" بھی

لگا ہوا ہے مگر حضورؐ نے اس نام کو جوں کا توں رہنے دیا۔ ایک اور صحابی کی کنیت ابو مالک تھی۔ "مالک" بھی اللہ کا نام ہے۔ مگر حضورؐ نے اسے بھی نہیں بدلا۔ اسی طرح کئی ایک صحابہ کرامؓ کے نام بھی ان ناموں کی طرح اللہ پاک کے ننانوے اسماء الحسنیٰ میں سے ہیں۔ مگر حضورؐ نے انہیں بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔

الاعلیٰ کی حقیقت

اَعْلٰی عُلُوٌّ مصدر سے افعل التفضیل کا صیغہ ہے۔ معنی ہیں سب سے اوپر، غالب، سب سے برتر، عُلْیَا اسی کا صیغۂ مونث ہے جس کی جمع عُلیٰ ہے۔ اعلیٰ کی جمع اَعْلَوْنَ ہے۔ یہ چاروں الفاظ اعلیٰ، اعلون، علیا اور علیٰ قرآن کریم میں استعمال ہوئے ہیں۔

۱ - وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا - (التوبہ: ۴۰) اور اللہ کا بول تو اونچا ہی ہے۔

۲ - تَنْزِيلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۔ (طٰہٰ: ۴)

"نازل کیا گیا ہے (قرآن)، اس ذات کی طرف سے جس نے پیدا کیا ہے زمین کو اور بلند آسمانوں کو۔"

۳ - وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى - (طٰہٰ: ۷۵)

۴ - "اور جو اس کے حضور مومن کی حیثیت سے حاضر ہوگا، جس نے نیک عمل کئے ہوں گے ایسے سب لوگوں کے لیے بلند درجے ہیں۔ . . ."

قرآن کریم میں لفظ "الاعلیٰ" کا استعمال

قرآن کریم میں یہ لفظ نو مقامات پر آیا ہے۔

۱ - لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ، وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى (النحل: ۶۰)

"بری صفات سے متصف کیے جانے کے لائق تو وہ لوگ ہیں جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے۔ رہا اللہ، تو اس کے لیے سب سے برتر (اعلیٰ) صفات ہیں۔"

۲ - قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَىٰ (طٰہٰ : ٦٨)

"ہم نے کہا، مت ڈر، تو ہی غالب (اعلیٰ) رہے گا۔"

۳ - وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (الروم: ٢٧)

آسمانوں اور زمین میں اس کی صفت سب سے برتر (اعلیٰ) ہے۔"

۴ - لَا يَسَّمَّعُونَ إِلَى الْمَلَإِ الْأَعْلَىٰ ...... (الصافات: ٨)

"(یہ شیاطین) ملاء اعلیٰ کی باتیں نہیں سن سکتے۔"

۵ - مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَإِ الْأَعْلَىٰ إِذْ يَخْتَصِمُونَ (ص: ٦٩)

"(ان سے کہو) مجھے اس وقت کی کوئی خبر نہ تھی جب ملاء اعلیٰ میں جھگڑا ہو رہا تھا۔"

۶ - وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ - (النجم: ٧) "اور وہ بالائی افق پر تھا۔"

۷ - فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ (النازعات: ٢٤)

"پس اس نے (فرعون نے) کہا: میں تم سب کا بڑا رب ہوں۔"

۸ - سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى (الاعلیٰ)

تسبیح بیان کر اپنے رب کی جو سب سے برتر (اعلیٰ) ہے۔

۹ - .... إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ (الیل: ٢٠)

مگر واسطے چاہنے مرضی اپنے رب کی جو سب سے برتر (اعلیٰ) ہے۔"

اللہ تعالیٰ کے لیے اسم صفت کے طور پر اس لفظ کا کہیں استعمال نہیں ہوا۔ صرف بعض مقامات پر اللہ تعالیٰ کے اسم صفت "رب" کی صفت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ

اوپر کے آخری تین حوالوں سے ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ مثل الاعلیٰ، ملاء اعلیٰ، افق الاعلیٰ میں مثل، ملاء اور افق کے لیے بطور صفت استعمال ہوا ہے ——— اور
اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب ہے کہ
"جادوگروں کے مقابلے میں تو ہی اعلیٰ (غالب) رہے گا۔"

مومنین کے لیے لفظ اعلیٰ کا استعمال

۱۔ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران: ۱۳۹)
"دل شکستہ نہ ہو، نہ غم کرو، تم ہی غالب رہوگے اگر تم مومن ہو۔"
۲۔ فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْا اِلَى السَّلْمِ ۖ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ...... (محمد: ۳۵)
"پس تم دل شکستہ نہ ہو اور صلح کی درخواست نہ کرو، تم ہی غالب رہنے والے ہو۔"
ان دونوں آیات میں لفظ "اَعْلَوْن" "اعلیٰ" کی جمع ہے جو مومنین کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اعلیٰ کا لفظ غیر خدا کے لیے عام استعمال ہوا ہے بلکہ قرآن و حدیث میں سے اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی جس میں اعلیٰ بول کر اللہ تعالیٰ کی ذات مراد لی گئی ہو۔

اردو روزمرہ میں اعلیٰ کا استعمال

اردو زبان میں یہ لفظ کثیر الاستعمال ہے۔ ذیل کے فقرات سے اس کی وسعت استعمال کا اندازہ کیا

جا سکتا ہے۔

۱۔ مورثِ اعلیٰ
۲۔ اعلیٰ و ارفع
۳۔ اعلیٰ مکارمِ اخلاق
۴۔ اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک
۵۔ اعلیٰ درجے کی چیز
۶۔ اعلیٰ کوالٹی
۷۔ اعلیٰ تعلیم
۸۔ ادنیٰ و اعلیٰ
۹۔ اسلاف کی اعلیٰ روایات
۱۰۔ اعلیٰ خاندان کا فرد
۱۱۔ کنبہ کا رکنِ اعلےٰ
۱۲۔ اعلیٰ سوسائٹی
۱۳۔ اعلیٰ حضرت
۱۴۔ اعلیٰ کارکردگی
۱۵۔ اعلیٰ علیین
۱۶۔ سالارِ اعلےٰ
۱۷۔ ناظمِ اعلےٰ
۱۸۔ کتاب کا معیار
۱۹۔ اعلیٰ ایڈیشن
کتابت و طباعت۔ اعلیٰ
(سستا کے مقابلے ہیں)

۲۔ اور سعدیؒ کا یہ مشہور شعر ہے
گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم
گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

یہ چند بطور مثال پیش کئے گئے ہیں جو ہماری روزمرہ بول چال اور تحریر و تقریر میں استعمال کئے جاتے ہیں۔

لفظ "ابو" کی وضاحت

ابو اَبٌ کی حالت رفعی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ لوگ اَبٌ کے معنی صرف باپ کے لیتے ہیں حالانکہ اس کا استعمال باپ کے علاوہ "صاحب" اور "والا" کے لیے بھی

عام ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ بلی سے بہت پیار کرتے تھے حضورؐ نے لقب عطا فرمایا:
ابوھریرہؓ : بلی سے پیار کرنے والا ، نہ کہ بلی کا باپ۔
ایک دن حضورؐ نے حضرت علیؓ کو دیکھا کہ سفید اور گرد آلود زمین پر لیٹے ہوئے ہیں۔ جس سے جسم گرد آلود ہو گیا ہے۔ حضورؐ نے ازراہِ محبت و شفقت ابوتراب کے لقب سے نوازا۔ جس کے معنی مٹی کا باپ نہیں بلکہ گرد آلود جسم والے کے ہیں۔

ابوالبرکات :- برکتوں والا
ابوالحسنات :- نیکیوں والا
ابوالکلام : قادرالکلام ، ماہر، صاحب کلام ——— اور
ابوالاعلیٰ : بلندی اور رفعت والا

(یہ مضمون ، ستمبر ۸۰ء کے "آئین" میں شائع ہو چکا ہے)

اہلِ بیتِ رسولؐ رضہ

★ اہل بیت

★ امہات المومنین

★ ازدواج مطہرات کا اخلاص ایمانی

★ حضرت عائشہ صدیقہ رض

★ اولاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اہلِ بیت

مولانا مودودی صاحب پر ایک الزام یہ بھی لگایا جا رہا ہے کہ انہوں نے ازواج مطہرات کی (نعوذ باللہ) توہین کی ہے۔ ذیل میں مولانا محترم کی تحریروں کے اقتباسات دیئے جا رہے ہیں جن کے مطالعہ سے قارئین پر حقیقت حال واضح ہو جائے گی اور وہ محسوس کریں گے کہ مولانا مودودی صاحب ایک سچے مسلمان کی طرح امہات المومنین کے ساتھ کتنی عقیدت رکھتے ہیں۔

انّما یرید اللہ لیذھب عنکم الرّجس اھل البیت ویطھّرکم تطھیراً

(احزاب: ۳۳) اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہلِ بیت نبیؐ سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے۔

محاورہ اور قرآن کے استعمالات اور خود اس آیت کا سیاق و سباق، ہر چیز اس چیز پر قطعی دلالت کرتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت میں آپؐ کی ازواج مطہرات بھی داخل ہیں اور آپؐ کی اولاد بھی۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ آیت کا اصل خطاب ازواج سے ہے اور اولاد مفہوم لفظ کے اعتبار سے اس میں شامل قرار پاتی ہے۔ اسی بناء پر ابن عباسؓ اور عروہ بن زبیرؓ اور عکرمہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں اہل البیت سے مراد ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ (تفہیم القرآن جلد چہارم ص ۹۲)

امہات المومنین

النّبیّ اولٰی بالمُومنین من انفسھم وازواجہٗ امّھاتھم۔ (احزاب: ۶)

(" بلاشبہ نبی تو اہل ایمان کے لیے ان کی اپنی ذات پر مقدم ہے اور نبی کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔")

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات صرف اس معنی میں امہاتِ مومنین ہیں کہ ان کی تعظیم و تکریم مسلمانوں پر واجب ہے اور ان کے ساتھ کسی مسلمان کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ باقی دوسرے احکام میں وہ ماں کی طرح نہیں ہیں۔ مثلاً اس کے حقیقی رشتہ داروں کے سوا باقی سب مسلمان ان کے لیے غیر محرم تھے جن سے پردہ واجب تھا۔ ان کی صاحبزادیاں مسلمانوں کے لیے ماں جائی بہنیں نہ تھیں کہ ان سے بھی مسلمانوں کا نکاح ممنوع ہوتا۔ ان کے بھائی بہن مسلمانوں کے لیے خالہ اور ماموں کے حکم میں نہ تھے۔ ان سے کسی غیر رشتہ دار مسلمان کو وہ میراث نہیں پہنچتی تھی جو ایک شخص کو اپنی ماں سے پہنچتی ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید کی رو سے یہ مرتبہ تمام ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو حاصل ہے جن میں لامحالہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی شامل ہیں۔ لیکن ایک گروہ نے جب حضرت علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما اور ان کی اولاد کو مرکز دین بنا کر سارا نظام دین انہی کے گرد گھما دیا، اور اس بنا پر دوسرے بہت سے صحابہ رضی کے ساتھ حضرت عائشہ رضی کو بھی ہدف لعن وطعن بنایا تو ان کی راہ میں قرآن مجید کی یہ آیت حائل ہو گئی، جس کی رو سے ہر اس شخص کو انہیں اپنی ماں تسلیم کرنا پڑتا ہے جو ایمان کا مدعی ہو۔ آخر کار اس مشکل کو رفع کرنے کے لیے یہ عجیب و غریب دعویٰ کیا گیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت علی رض کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی ازواج مطہرات میں سے جس کو چاہیں آپؐ کی زوجیت پر باقی رکھیں اور جسے چاہیں آپؐ کی طرف سے طلاق دے دیں۔ اس سلسلہ میں جس روایت کا سہارا لیا گیا ہے اصول روایت کے اعتبار سے تو وہ سراسر

بے اصل ہے ہی، لیکن اگر آدمی اسی سورہ احزاب کی آیات ۲۸، ۲۹ اور ۵۱، ۵۲ پر غور کرے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ روایت قرآن کے بھی خلاف پڑتی ہے کیوں کہ آیت تخییر کے بعد جن ازواج مطہرات نے ہر حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی رفاقت کو اپنے لیے پسند کیا تھا، انہیں طلاق دینے کا اختیار حضورؐ کو باقی نہ رہا تھا۔

علاوہ بریں ایک غیر متعصب آدمی اگر محض عقل ہی سے کام لے کر اس روایت کے مضمون پر غور کرے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ انتہائی لغو اور رسول پاکؐ کے حق میں سخت توہین آمیز افترا ہے۔ رسول کا مقام تو بہت بالاتر و برتر ہے، ایک معمولی شریف آدمی سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی وفات کے بعد اپنی بیوی کو طلاق دینے کی فکر کرے گا اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت اپنے داماد کو یہ اختیار دے جائے گا کہ اگر کبھی تیرا اس کے ساتھ جھگڑا ہو تو میری طرف سے تو اسے طلاق دے دیجیو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اہل بیت کی محبت کے مدعی ہیں ان کے دلوں میں صاحب البیت کی عزت و ناموس کا پاس کتنا کچھ ہے، اور اس سے بھی گزر کر خود اللہ تعالیٰ کے ارشادات کا وہ کتنا احترام کرتے ہیں۔

(تفہیم القرآن جلد چہارم، صفحہ ۴۲، ۴۳)

ازواج مطہراتؓ کا اخلاص ایمانی

آیت تخییر کے نزول کے وقت حضورؐ کے نکاح میں چار بیویاں تھیں، حضرت سودہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ اور حضرت ام سلمہؓ۔ ابھی حضرت زینبؓ سے حضورؐ کا

نکاح نہیں ہوا تھا۔ جب یہ آیت (سورہ احزاب، آیت ۲۹) نازل ہوئی تو آپؐ نے سب سے پہلے حضرت عائشہؓ سے گفتگو کی اور فرمایا۔

"میں تم سے ایک بات کہتا ہوں، جواب دینے میں جلدی نہ کرنا، اپنے والدین کی رائے لے لو، پھر فیصلہ کرو۔"

پھر حضورؐ نے ان کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آیا ہے، اور یہ آیت ان کو سنا دی۔ انہوں نے عرض کیا۔ "کیا اس معاملہ کو میں اپنے والدین سے پوچھوں؟ میں تو اللہ اور اس کے رسولؐ اور آخرت کو چاہتی ہوں۔" اس کے بعد حضورؐ باقی ازواج مطہرات میں سے ایک ایک کے ہاں گئے اور ہر ایک سے یہی بات فرمائی، اور ہر ایک نے وہی جواب دیا جو حضرت عائشہؓ نے دیا تھا۔

(تفہیم القرآن، جلد چہارم صہ ۸۵)

ازواج مطہراتؓ کے لیے یہ ایک بہت بڑا شرف تھا کہ انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسی بلند گ ترین ہستی کی زوجیت حاصل ہوئی اور اس کی بدولت ان کو یہ موقع نصیب ہوا کہ دعوت و اصلاح کے اس عظیم الشان کام میں آپؐ کی رفیق کار بنیں جو رہتی دنیا تک انسانیت کی فلاح کا ذریعہ بننے والا تھا۔ اس مقصد کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس غیر معمولی ایثار و قربانی سے کام لے رہے تھے اور تمام صحابۂ کرامؓ اپنی حدِ استطاعت تک قربانیاں کر رہے تھے، اسی طرح ازواج مطہرات کا بھی یہ فرض تھا کہ ایثار سے کام لیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو تمام ازواج رسولؐ نے بخوشی قبول کیا۔

(تفہیم القرآن، جلد چہارم صہ ۱۱۸)

حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ

حضرت عائشہ رضؓ پر منافقین کے جھوٹے الزام کی تردید کرتے ہوئے یہ ہدایت کی گئی کہ آنکھیں بند کر کے ہر شریف آدمی کے خلاف ہر قسم کی تہمتوں کو قبول نہ کر لیا کرو، اور نہ ان کو پھیلاتے پھرو، اس طرح کی افواہیں اگر اڑ رہی ہوں تو انہیں دبانا اور ان کا سدِباب کرنا چاہیئے، نہ یہ کہ ایک منہ سے لے کر دوسرا منہ اسے آگے پھونکنا شروع کر دے۔ (تفہیم القرآن، جلد سوم، صد ۳۱۶)

ازواجِ مطہراتؓ میں سے کسی نے بھی سوکن کی بدنامی میں ذرہ برابر حصہ نہ لیا بلکہ کسی نے اس پر ادنیٰ درجے میں بھی اپنی رضا اور پسند کا، یا کم از کم قبولیت کا اظہار تک نہ کیا حتیٰ کہ حضرت زینبؓ کی سگی بہن حمنہ بنت جحش محض ان کی خاطر ان کی سوکن کو بدنام کر رہی تھیں، مگر خود انہوں نے سوکن کے حق میں کلمۂ خیر ہی کہا۔ حضرت عائشہ رضؓ کی اپنی روایت ہے کہ ازواجِ رسول اللہ ؐ میں سب سے زیادہ زینبؓ ہی سے میرا مقابلہ رہتا تھا۔ مگر واقعہ افک کے سلسلہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ عائشہ رضؓ کے متعلق تم کیا جانتی ہو تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ خدا کی قسم میں اس کے اندر بھلائی کے سوا اور کچھ نہیں جانتی۔ حضرت عائشہ رضؓ کی اپنی شرافتِ نفس کا یہ حال تھا کہ حضرت حسان بن ثابت نے انہیں بدنام کرنے میں نمایاں حصہ لیا، مگر وہ ہمیشہ ان کے ساتھ عزت اور تواضع ہی سے پیش آتی رہیں۔

(تفہیم القرآن، جلد سوم، صد ۳٦٦)

ان الذین جاء و بالافک عصبۃ منکم۔ (جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں

وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولہ ہیں ۔)

یہ اشارہ ہے اس الزام کی طرف جو حضرت عائشہؓ پہ لگایا گیا تھا۔ اس کو اِنک کے لفظ سے تعبیر کرنا خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس الزام کی مکمل تردید ہے! اِنک کے معنی ہیں بات کو الٹ دینا، حقیقت کے خلاف کچھ سے کچھ بنا دینا۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ قطعی جھوٹ اور افترا کے معنی میں بولا جاتا ہے اور اگر کسی الزام کے لیے بولا جائے تو اس کے معنی سراسر بہتان کے ہیں۔

اولاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یاایھا النبی قل لازواجک وبنٰتک ونساء المومنین ۔۔۔(احزاب: ۵۹)

(اے نبی، اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہلِ ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں۔)

ضمناً ایک اور مضمون جو اس آیت سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی بیٹیاں ثابت ہوتی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے۔ " اے نبی، اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کہو۔"

یہ الفاظ ان لوگوں کے قول کی قطعی تردید کر دیتے ہیں جو خدا سے بے خوف ہو کر بے تکلف یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں اور باقی صاحبزادیاں حضورؐ کی اپنی سلبی بیٹیاں نہ تھیں بلکہ گیلسرڈ تھیں۔ یہ لوگ تعصب میں اندھے ہو کر یہ بھی نہیں سوچتے کہ اولادِ رسولؐ کے نسب سے انکار کر کے وہ کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں اور اس کی کیسی

سخت جواب وہی انہیں آخرت میں کرنی ہو گی۔ تمام معتبر روایات اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے حضورؐ کی صرف ایک بیٹی حضرت فاطمہؓ ہی نہ تھیں بلکہ تین اور بیٹیاں بھی تھیں۔ حضورؐ کے قدیم ترین سیرت نگار محمد بن اسحاق حضرت خدیجہؓ سے حضورؐ کے نکاح کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: ابراہیمؑ کے سوا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اولاد انہی کے بطن سے پیدا ہوئی اور ان کے نام یہ ہیں: قاسمؓ اور طاہرؓ وطیبؓ، اور زینبؓ، اور رقیہؓ اور ام کلثومؓ اور فاطمہؓ۔

(سیرت ابن ہشام، جلد اول، ص ۲۰۲)

مشہور ماہر علم انساب ہشام بن محمد بن السائب کلبی کا بیان ہے کہ مکہ مکرمہ میں نبوت سے قبل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں سب سے پہلے قاسمؓ پیدا ہوئے، پھر زینبؓ، پھر رقیہؓ پھر ام کلثومؓ۔ (طبقات ابن سعد، جلد اول، ص ۱۳۳)

ابن حزم نے جوامع السیرۃ ص ۳۸، ۳۹ میں لکھا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے حضورؐ کی چار لڑکیاں تھیں۔ سب سے بڑی حضرت زینبؓ، ان سے چھوٹی رقیہؓ، ان سے چھوٹی فاطمہؓ اور ان سے چھوٹی ام کلثومؓ۔

تمام علمائے انساب متفق ہیں کہ آپؐ کی صلب سے اور حضرت خدیجہؓ کے بطن سے وہ چاروں صاحبزادیاں پیدا ہوئیں جن کے نام اوپر مذکور ہوئے ہیں۔

(طبری جلد دوم ص ۴۱۱ - طبقات ابن سعد جلد ۸ ص ۴ تا ۱۶ وغیرہ)

ان تمام بیانات کو قرآن مجید کی یہ تصریح قطعی الثبوت بنا دیتی ہے کہ حضورؐ کی ایک ہی صاحبزادی نہ تھیں بلکہ کئی صاحبزادیاں تھیں۔

(تفہیم القرآن جلد چہارم، ص ۱۳۰، ۱۳۱)